# دنیاپر غالب نظام حکومت کی خودساختہ اسلام دشمنی

**مولف**: ہادی آجیلی
**مترجم**: منہال حسین خیرآبادی

علم سیاست کی رو سے دیکھا جائے تو اصطلاح میں ''گفتگو'' کا مطلب ہے: بیانات، خیالات اور مفاہیم کا ایک ایسا مجموعہ جن کے درمیان ایک منطقی رابطہ پایا جاتا ہے اور اسی رابطہ کی بنیاد پر اسے مستقل اور نئی شناخت ملتی ہے جو آخرکار دنیا سے متعلق ہمارے تصورات اور عقائد و نظریات کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔

جدید نظریات گفتگو کو ایک سماج پر مسلط آئیڈیالوجی کی جگہ کھڑا کرتے ہیں اور اسے ایک مستقل مکتب فکر کی صلاحیت و قابلیت عطا کرتے ہیں یعنی جب بھی کوئی گفتگو اور گفتمان کسی سماج پر حاکم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ضرور ایک مخصوص مکتب فکر ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کی تعریف ہوتی ہے اور اس کے حدود معین کئے جاتے ہیں۔

جب بھی کوئی مکتب فکر کسی سماج پر اپنا قبضہ جمانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے رقیب آئیڈیالوجی کو مغلوب کرنا اور راستے سے ہٹانا پڑتا ہے، اس کے بعد اسے ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک نئی آئیڈیالوجی کو یہ مقام و منزلت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب مطلوبہ سماج خود بھی اس نئی آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے یعنی آئیڈیالوجی کے بنیادی تصورات اور خیالات سماج کی رگوں کے اندر نفوذ کر جائیں، لہٰذا اگر کوئی سماج کسی آئیڈیالوجی کو قبول نہ کرے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آئیڈیالوجی ابھی تک ناقص ہے اور قدرت نمائی کے مرحلہ تک نہیں پہنچی ہے۔ کوئی بھی نئی گفتگو دو طریقوں سے غلبہ حاصل کرتی ہے: سلبی اور ایجابی۔ سلبی طریقہ میں سب سے پہلے عدمیات کی بحث سامنے آتی ہے یعنی سماج میں کیا نہیں ہے۔ اس مرحلہ میں وہ مسلسل عدمیات کو شمار کرتی ہے، گویا وہ عدمیات کی مرہون منت ہے اس لئے کہ جب بھی کوئی نئی آئیڈیالوجی وجود میں آتی ہے اور عدمیات کی بحث کو چھیڑتی ہے تو اس بحث کے

آغاز ہوتے ہی اس کا وجود مسلّم الثبوت ہو جاتا ہے۔

اس بات کو اگر ایک نئی عبارت میں پیش کیا جائے تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ آئیڈیالوجی اپنی شناخت کو معین و مشخص کرنے کے لئے دیگر رقیب آئیڈیالوجی کے مقابلے میں اپنی غیریت اور اپنی ایک مستقل شناخت کو معین کرنے کی راہ میں قدم اٹھاتی ہے۔ اس نئی شناخت کو معین اور مشخص کرنے کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس علم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کسی آئیڈیالوجی کو رقیب آئیڈیالوجی کے مقابلہ میں غیریت حاصل نہ ہوسکے اور اس کے حدود معین نہ ہوسکیں تو اس کے لئے جعلی غیریت کو معین و مشخص کرنا ضروری ہے یعنی ایک دشمن کے وجود کی برکت سے ایک گفتگو کے جملہ ارکان ایک محور پر قائم ہوجاتے ہیں لہٰذا ہر مکتب فکر یا آئیڈیالوجی کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے برابر کا ایک دشمن سراغ لگائے جس کی مدد سے وہ اپنی شناخت کو معین و مشخص کرسکے۔ اگر کسی آئیڈیالوجی کا دشمن اس کے قد سے چھوٹا ہو تو اسے چاہئیے کہ اپنے دشمن کو بڑا اور اپنے برابر میں پیش کرے تاکہ اسے اعلی مقام اور رتبہ مل سکے جیسا کہ امریکہ کے لئے صدام جیسا دشمن کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا اور یقیناً امریکہ جیسی عظیم حکومت کے لئے صدام کا قد بہت چھوٹا تھا لیکن امریکیوں نے صدام کو عالمی پیمانہ پر ایک عظیم دشمن کی شکل میں پیش کیا اور پوری دنیا کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کردیا۔

مذکورہ سلبی اقدامات کے بعد اب دوسرا مرحلہ ایجاب و قبول سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک آئیڈیالوجی کے مفاہیم کی تبلیغ کا موقع فراہم ہوتا ہے اس لئے کہ کسی بھی آئیڈیالوجی کے مقام و مرتبہ کو ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ سلبی اقدامات ایجابی اقدامات پر مقدم ہوتے ہیں البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ رقیب آئیڈیالوجی کو معین کرنا اپنی شناخت کا باعث ہوتا ہے لیکن بعض اوقات معکوس نتیجہ بھی ظاہر ہوسکتا ہے، اس لئے کہ جہاں ایک طرف آئیڈیالوجی کی ماہیت مشخص ہوتی ہے وہیں دوسری طرف جب کوئی آئیڈیالوجی اپنے غیر کو رقیب کی نظر سے دیکھتی ہے تو گویا وہ اسے بزرگی اور برابری کا درجہ دیتی ہے اور ناخواستہ طور پر اسے اپنی جانشین اور ایک بدیل بنا بیٹھتی ہے، یعنی یہ امکان پایا جاتا ہے کہ ایک غالب اور مسلط آئیڈیالوجی کی ضعف و ناتوانی کی بنا پر اس کے ماتحت مناطق اس کے رقیب کی جانب جھک جائیں اسی وجہ سے یہ کہنا بجا ہے کہ شناخت کو مستقل کرنا اور غیریت پر زور دینا کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے گویا اس کی مثال دودھاری تلوار کی مانند ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں عالمی پیمانہ پر مسلط مغربی آئیڈیالوجی نے اسلام کو اپنا رقیب مان لیا

ہے؟اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ ۱۹۷۹ء میں ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد امریکہ کے منافع کو دو زاویوں سے سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس عظیم واقعہ کے بعد سیاست کے میدان میں امریکہ کے ماتحت مناطق بکھر گئے اور ایران میں ایک ایسی حکومت نے جنم لیا جو امریکہ کے جبری اور مسلط نظام کے مقابلے میں قیام کا ارادہ رکھتی تھی اس لئے کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے عالمی پیمانہ پر دو قطبی نظام کو للکارا تھا اور اس کی وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس نے مغربی طاقت امریکہ اور مشرقی طاقت روس سے منھ موڑ کر ایک مستقل راستہ اپنایا تھا۔ ایران کا یہ جسورانہ اقدام مستقبل میں ایشیا جیسے غنی اور ثروتمند خطے میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

انقلاب اسلامی ایران کے قیام کے بعد مشرقی اور مغربی طاقتوں کو اس کے وجود سے جو خطرہ لاحق تھا اس سے کہیں زیادہ خطرہ اسلامی انقلاب کی آئیڈیالوجی سے تھا جس نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا یعنی جب دنیا والے دو قطبی نظام میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے آزاد خیال اور اشتراکی پارٹیوں کے ٹھیکیداروں یعنی امریکہ اور روس کا سہارا لینا چاہتے تھے اور ہر ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے میں کوشاں تھے، ایسے حالات میں جب کہ مغربی دانشوروں نے دین کو معطل، بے اثر اور اسے اپنا بازیچہ و کھلونا بنا رکھا تھا اور دین و سیاست کی جدائی کا مسئلہ عالمی پیمانہ پر تسلیم شدہ قرار دے دیا گیا تھا، میشل فوکو کے بقول ایک الٰہی انقلاب وجود میں آیا جس نے مغربی فکر کو تہہ و بالا کر دیا اور اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اس لئے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ قائم ہونے والا نظام ایک ایسی حکومت کا خواہاں تھا جو اسلامی احکام پر قائم ہو اور عالمی ستمکاروں کے مقابلے میں ڈٹا رہے، اس کا نعرہ تھا نہ مغرب، نہ مشرق بلکہ فقط اسلامی جمہوریت۔

ہم یہاں پر اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے کہ مغربی آئیڈیالوجی کو انقلاب اسلامی کے ذریعہ جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ اشتراکی آئیڈیالوجی کے ذریعہ اٹھائے گئے نقصانات سے کہیں زیادہ ہے اور ان دونوں کا ہرگز ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ کمیونزم الحاد اور مادیت کے اعتبار سے لبرل ازم سے بہت مشابہ ہے لیکن اسلام نے سیاست کے میدان میں دین کو دوبارہ پیش کرنے اور اسلامی تعلیمات کے سہارے حکومت کرنے کے فرضیہ کو ثابت کر کے مغربی آئیڈیالوجی یعنی دین و سیاست کی جدائی اور مادیت کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔ موجودہ رائج اور مسلط آئیڈیالوجی اس خیال میں تھی کہ عالمی پیمانہ پر دین و سیاست کی جدائی کو مان لیا گیا ہے اور اسے ایک تسلیم شدہ امر قرار دے دیا گیا ہے لیکن بیسویں صدی میں اسلامی

انقلاب نے ان کے خواب و خیال پر پانی پھیر دیا اور ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی بنیاد دین و سیاست کی یکجہتی پر قائم تھی۔ اس طرح وہ مغربی آئیڈیالوجی کو روندتے ہوئے دین کے اصول و مبانی کے سہارے ایک مستقل آئیڈیالوجی کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اسی وجہ سے مغربی آئیڈیالوجی کو اپنے وجود کے متعلق خطرہ محسوس ہونے لگا اور ان کا یہ احساس بجا بھی تھا، اسی خطرہ کے احساس کے بعد انہوں نے اسلامی آئیڈیالوجی اور مکتب فکر کو اپنا رقیب مان لیا اور اسے اپنے وجود کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھنے لگے۔ اسی خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے انہوں نے بہت پہلے سے اس کے خلاف پروپگنڈے اور زہر افشانی شروع کر دی تھی اور اس وقت بھی بہت زور و شور سے جاری ہے۔

ہمیں اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت مغربی سماج میں بعض ایسے مشکل مسائل پیش آ گئے ہیں جن کے جوابات اسلامی مباحث میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ انہیں مشکل مسائل میں سے ایک مسئلہ شناخت کی گمشدگی ہے جو دوسری عالمی جنگ یا اس کے بعد وجود میں آیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور عصر نو کے تمدن کی ایک سیاہ تاریخ رقم ہو گئی۔ اس عظیم تباہی کے بعد مغربی انسان عصر نو کی جدیدیت اور اپنی شناخت کی تعریف کرنے میں مردد ہو گیا یہاں تک کہ انسانوں کا ایک عظیم گروہ جو عدمیت اور جدیدیت کا نقاد بنا حقیقت میں وہ جدیدیت کو تمام مصائب و آلام کی بنیاد سمجھنے لگا تھا اور اسی تردد میں وہ عدمیت کا شکار ہو گیا۔

اس عظیم جنگ کے خاتمہ کے بعد حاکم نظام یعنی سرمایہ داری اور اس کے بھید بھاؤ اور بے عدالتی کے خلاف بغاوت اور اعتراضات کا بازار رونق پا گیا اور اگر امریکہ نے یورپ کے اقتصاد کی فرسودہ کشتی کو مارشل منصوبہ کے ذریعہ کنٹرول نہ کیا ہوتا اور اس میں جان نہ ڈالی ہوتی تو یہ اندیشہ پیدا ہو چکا تھا کہ یورپی سماج لیبرل نظام کے خلاف قیام کے باعث سویت یونین کے حملہ کے بغیر کمیونسٹ ہو جائے گا۔ اس کی سب سے واضح اور زندہ مثال یورپین ممالک میں موجود کمیونسٹ پارٹیاں ہیں جو اس وقت فرانس اور اٹلی میں طاقتور مکتب فکر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ مغربی سماج میں شناخت کا بحران مختلف شعبہ ہائے حیات میں جیسے آرٹ، موسیقی، سینما، ادبیات اور لباس پوشی کے نئے رنگ و ڈھنگ میں ظاہر ہو چکا ہے اور اس وقت جدیدیت اور اس کے مظاہر کے خلاف یورپ میں ہر طرف سے زبردست حملے ہو رہے ہیں اور اسے زبردست مسائل و مشکلات کا سامنا ہے۔

موجودہ دور میں مغربی سماج کی سب سے بڑی مشکل معنویت کا نہ ہونا ہے۔اس وقت مغربی سماج میں بے دینی اور دین سے دوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہاں لوگ خود بخود اپنی فطری احساسات کی بناپر معنویت اور دینداری کی طرف مایل ہورہے ہیں۔ مغربی سماج میں معنویت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے اور لوگوں کے درمیان شناخت کے بحران کو کم کرنے کے لئے من گھڑت اور جعلی معنویت جیسے امریکہ کے اصلی باشندوں کا عرفان، شیطانی عرفان، یاشینتو، اوشو، اکنکار، زِن، کابالا وغیرہ کو مختلف شکل و صورت میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ عرفان کی مذکورہ تمام جعلی صورتیں جسے مسلط آئیڈیالوجی نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ سب کے سب ماہیت کے اعتبار سے فرد گرا ہیں اور ان میں کسی بھی طرح سے سیاسی اور اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا۔

شاید یہ بات کہنا بجا ہو کہ معنی کا بحران مغربی سماج کی تمام مشکلات جیسے شناخت کا بحران، بحران معنویت اور گھرانوں کی تباہی وبربادی سے کہیں زیادہ سخت ہے اس لئے کہ آج کا مغربی انسان معنی کی تعیین اور زندگی کے ہدف کو سمجھنے سے بالکل عاجز نظر آرہا ہے اور جدیدیت کے دانشمندوں کے پاس اس مشکل کے لئے کوئی راہ حل اور جواب نہیں ہے، مخصوصا جدیدیت کو مترقی سمجھنے والے بنیادی طور پر عدمیت کے قائل ہیں اور کسی بھی فکر و نظر کو قابل بھروسہ نہیں سمجھتے اسی وجہ سے آج کا مغربی انسان شدت سے ایک زبردست پشت پناہ کی تلاش اور اپنی شناخت کی تعریف اور اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے کی تگ ودو میں منہمک ہے اور کبھی کبھی شناخت اور زندگی کے معنی کو سمجھنے لئے مجبور ہو کر جھوٹی شناخت جیسے کسی موسیقی گروپ کی حمایت کی طرف رخ کرتا ہے اور ان سے اپنے احساسات کو جوڑ کو اس احساس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس وقت پورے عالم میں موجود تمام ادیان ومکاتب کے درمیان اگر کوئی دین موجودہ انسان کے سوالوں کا جواب دے سکتا ہے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے تو وہ دین اسلام ہے، اس لئے کہ دیگر ادیان جیسے عیسائیت، یہودیت، بودیسم اور کنفوسیو سیسم ہر گز ظلم و ستم اور موجودہ صورت حال کے خلاف قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ ہرگز اپنے ماننے والوں کے لئے بے عدالتی کے خلاف قیام اور غلامی کی زنجیروں سے رہائی کے لئے کوئی نمونہ عمل پیش نہیں کر سکتے، لیکن اسلام ایک سماجی اور کمال یافتہ دین ہونے کی بناپر ظلم و ستم کے خلاف جہاد اور عدالت طلبی کے لئے قیام کا طور طریقہ یورپین سماج مخصوصا مہاجروں اور دیگر اقوام و ملل کے لئے پیش کر سکتا ہے جو اپنی حکومتوں کے ناروا سلوک کا شکار ہیں اور اس

طرح انہیں شناخت، معنویت اور بامقصد زندگی جینے کا طریقہ سکھا سکتا ہے۔

پس اگر یورپی سماج کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ آسانی سے اسلام کے ذریعہ اپنی تمام مشکلات کا حل اور سوالوں کا جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی سب سے زندہ مثال اس وقت یورپی سماج میں اسلام کی طرف بڑھتا ہوا میلان ہے اور یہ میلان اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر آج یورپین ممالک تشویش میں مبتلا ہوگئے ہیں، اسی تحریک کو روکنے کے لئے انہوں نے عالمی پیانہ پر اسلام کے خلاف زہریلی تبلیغات کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہر طرف اسلام کے خلاف پروپگنڈے میں مشغول ہوگئے، اس لئے کہ وہ اپنے سماج کو اسلامی تعلیمات اور اس کی جذابیت کی زد میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور ان کی آئیڈیالوجی نابودی کے خطرہ سے نزدیک ہو چکی ہے۔

ایک دوسری عبارت میں یوں کہنا مناسب ہے کہ اس وقت اسلام کی ترقی اور اس ترقی سے موجودہ آئیڈیالوجی کو لاحق خطرہ سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے یورپی سماج کے سربراہوں کے پاس دنیا والوں کے سامنے اسلام کا خوفناک چہرہ اور تحریف شدہ اسلام پیش کرنے اور مسلمانوں کو دہشت گرد بتانے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے، اس لئے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ اگر انہوں نے اسلام سے مقابلہ میں معمولی سی کوتاہی بھی کی تو یہ تحریک پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

البتہ موجودہ آئیڈیالوجی کی جانب سے ایسے تحقیر آمیز حربے استعمال کرنا، نفرت و خوف کا بازار گرم کرنا اور تحریفات کا سہارا لینا کوئی نئی بات نہیں ہے اور تاریخ میں اس کی مثالیں کم نہیں ہیں یا یوں کہا جائے کہ اسلام سے متعلق تحریفات کی کہانی صرف اسلام سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں اس لئے کہ غالب فکر اور مسلط آئیڈیالوجی اپنی حیات کو باقی رکھنے کے لئے مجبور ہے کہ وہ کسی غیر کو تلاش کرے اور اس کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو مستقل بنائے۔ اس واقعیت کی ایک زندہ مثال دوسری عالمی جنگ کے دوران فاشیزم اور نازی ازم کے درمیان دیکھنے کو ملتی ہے جو اپنی بقا کے لئے غیریت اور استقلال کی تلاش میں ہیں۔ جرمنی کے خلاف پروپیگنڈے اس قدر شدید تھے کہ ٹوٹی ہوئی صلیب شیطان کی نشانی سمجھی جانے لگی تھی اور کسی کو گرفتار کرنے، اسے شکنجہ کرنے اور اسکے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے اس پر فاشیست کی تہمت لگانا کافی تھی۔

فاشیزم کے خاتمہ اور دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر کمیونیزم کے مقابلے میں لیبرل سرمایہ داری نے

قیام کیا اور مشرقی طاقت روس کی کمیونسٹ حکومت اور اس کے تحت الحمایہ حکومتوں کے خلاف سخت پروپیگنڈے میں مشغول ہوگئے، اسی زہریلی تبلیغات کے سایہ میں امریکہ نے عالمی فضا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ایک حصہ کو لیبرل سرمایہ داری کا نام دیا اور دوسرے کو کمیونزم کا نام دیا اور کمیونسٹی فکر اور اس کے حامیوں کو دنیا کی تمام مصیبتوں اور بلاؤں کا سرچشمہ قرار دیا۔ رونالڈ ریگن کی جانب سے اسے شیطانی شہنشاہیت کا لقب دیا گیا۔ امریکہ نے کمیونزم سے مقابلہ کے لئے مک کارٹیسم کو جاری کیا اور کمیونسٹ ہونے یا روس سے رابطہ رکھنے کو سخت جرم قرار دیا اور اس کے لئے جیل کی سزا مقرر کردی گئی، اسی طرح کمیونزم کی ترقی کو روکنے کے بہانے دنیا کے مختلف ممالک میں بغاوت اور فوجی مداخلت کا راستہ ہموار کیا جانے لگا اور امریکہ نے اسے اپنا ہتھکنڈہ بناتے ہوئے بہت سے ملکوں میں مداخلت کی اور وہاں پر بغاوت کے راستے ہموار کئے۔

سرد جنگ کے خاتمہ اور سویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد اب لیبرل سرمایہ داری کا کوئی رقیب نہیں تھا، پس ایک بار پھر اسے ایک رقیب کی ضرورت کا احساس ہوا لہٰذا اس نے اس کردار کو نبھانے کے لئے سیاسی اسلام کا انتخاب کیا البتہ سیاسی اسلام کے مظاہر جیسے اسلامی جمہوریہ ایران یا القاعدہ تنظیم مسلط آئیڈیالوجی کے لئے چھوٹے تھے لہٰذا اسے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے اس دشمن کو عظیم دکھانا اور دنیا والوں کے سامنے اسے عالمی دشمن کی حیثیت سے پیش کرنا بہت ضروری تھا، پس اس نے اس منحوس منصوبے کو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعہ کے ذریعہ عملی بنایا۔

اس حادثہ کی مدد سے سیاسی اسلام کی گفتگو مسلط آئیڈیالوجی کے قد و قامت کے برابر نظر آنے لگی۔ اس طرح سیاسی اسلام اور دہشت گردی کے درمیان رابطہ جوڑا گیا اور دہشت گردی، فاشیزم اور کمیونزم کے بعد مسلط آئیڈیالوجی کا مد مقابل اور ایک بہترین رقیب ابھر کر سامنے آیا جسے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ پس اس سوال کا جواب کہ کیوں پرانی طرز کی زہر افشانی اور خوف و ہراس کا ماحول اس وقت بہت تیزی سے اسلام کے خلاف بروئے کار لایا جارہا ہے اور غیر معمولی طور پر مسلمانوں کو اس کا نشانہ بنایا جارہا ہے، ہمیں مسلط آئیڈیالوجی کی بقا اور غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے ایک رقیب کی تلاش اور اسے اپنا مد مقابل بنا کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔